زہرا نگاہ

Firaq

Zehra Nigah

اشاعت: ۲۰۰۹ء

کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی

طباعت: اے جی پرنٹرز، کراچی

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
info@scheherzade.com

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

انتساب

احمد کے نام

"مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمرِ گذشتہ کی کتاب"

تم سے روٹھے بھی بہت اور تمہیں چاہا بھی بہت
روٹھنا یاد ہے، چاہت کا نہیں کوئی حساب

فیض صاحب سے معذرت کے ساتھ۔ ان کا ایک ہی شعر کافی تھا۔ مگر میرے دل نے ایک شعر کا اضافہ کر دیا ہے۔

قفس میں بھی بہار باغ سے حاصل حضوری ہے
چمن کی سیر کر لیتے ہیں ہم دل کے صنوبر سے
مصحفی

فہرست

Scanned with CamScanner

حرفِ سپاس

سب سے پہلے مجھے شکریہ ادا کرنا ہے ڈاکٹر نجیب الرحمٰن صاحب کا جن کی لکھی ہوئی چند سطور اس عمر میں بھی میرے لیے باعثِ فخر ہیں۔

پھر اپنے نہایت معزز اور مہربان دوست اور بین الاقوامی شہرت یافتہ مصور مقبول فدا حسین صاحب کا — جنھوں نے سرِ ورق بنا کر کتاب کے عنوان کو اپنے رنگ سے واضح کیا۔ وہ کچھ نظموں کی آرائش بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے ہی احسانوں کے بوجھ تلے گردن ڈال دی۔۔۔

مخدومی و مکرمی مشتاق احمد یوسفی صاحب کا جنھوں نے اکثر و بیشتر ان تمام منظومات کو سنا اور ایک مختصر سے جملے سے تعریف کی مہر لگا دی، ''اب انھیں چھپوا دیجیے۔''

پھر نہایت محترم دوست انتظار حسین صاحب کا جنھوں نے دو تین بار میری شاعری پر گفتگو کی۔ محترم ساقی فاروقی نے میری پہلی کتاب پر پہلا مضمون لکھا۔ محترمہ خالدہ حسین کی ممنون ہوں جنھوں نے ایک سیر حاصل مضمون میری شاعری کے بارے میں لکھا۔

آخر میں ان تمام لوگوں کا، جن میں عزیز و اقارب اور دوست شامل ہیں۔ کچھ ہیں، کچھ بہت دور ہیں۔ مگر مجھے تو لگتا ہے میرے ساتھ ہی ہیں۔

آصف کے لیے کیا کہوں، سوائے اس کے کہ دعائیں ہی دعائیں۔

زہرا نگاہ

ایک میرے سامنے ہے ایک میری یاد میں
دو زمانے چل رہے ہیں وقت کی تقویم میں

ہر حکمران آ کے بعد ناز و افتخار
پچی زمیں پہ کھینچتا ہے جھوٹ کا حصار

منصف کے بھی گلے میں ہے اک طوقِ فردِ جرم
انصاف کس سے مانگئے، ہم سے گناہ گار

"عالم کی گفتگو سے بھی آتی ہے بوئے خوں"
سوداؔ نے اپنے شعروں میں لکھا ہے بار بار

ہر مدرسے میں درسِ شہادت ہے سُرخ رو
درسِ حیات سارے ہوئے نذرِ انتشار

☆

سفر خود رفتگی کا بھی عجب انداز کا تھا
کہیں پر راہ بھولے تھے ، نہ رک کر دم لیا تھا

زمیں پر گر رہے تھے چاند تارے جلدی جلدی
اندھیرا گھر کی دیواروں سے اونچا ہو رہا تھا

چلے چلتے تھے رہرو ، ایک آواز اٹھی پر
جنوں تھا ، یا فسوں تھا ، کچھ تو تھا جو ہو رہا تھا

میں اُس دن تیری آمد کا نظارہ سوچتی تھی
وہ دن جب تیرے جانے کے لیے رُکنا پڑا تھا

اسی حسنِ تعلق پہ ورق لکھتے گئے لاکھ
کرن سے روئے گل تک ایک پل کا رابطہ تھا

بہت دن بعد زہرا تو نے کچھ غزلیں تو لکھیں
نہ لکھنے کا کسی سے ، کیا کوئی وعدہ کیا تھا

☆

صورت دل کشی رہی، خواہش زندگی رہی
داغ دل خراب سے، رات میں روشنی رہی

تیرے سبھی کلاہ پوش، کوہ غرور سے گرے
اپنی تو ترک سر کے بعد، عشق میں برتری رہی

ساتویں آسماں تک شعلۂ علم و عقل تھا
پھر بھی زمینِ اہلِ دل کیسی ہری بھری رہی

آپ ہُوا ہے مندمل، گُل نے بہار کی نہیں
شہرتِ دست چارہ گر، زخم ہی ڈھونڈتی رہی

کہتے ہیں ہر ادب میں ہے، ایک صدائے بازگشت
میر کے حسنِ شعر سے میری غزل بھی رہی

☆

یہ جو مثلِ غبار راہ میں ہیں
دیدنی تھے اگر ٹھہر جاتے

اس کی راہوں میں راہِ شعر بھی تھی
ورنہ بے نام ہی گزر جاتے

☆

رات عجب آسیب زدہ سا موسم تھا
اپنا ہونا، اور نہ ہونا، مُبہم تھا

ایک کُل تنہائی تھا، جو ہمدم تھا
خار و غبار کا سرمایہ بھی کم کم تھا

آنکھ سے کٹ کٹ جاتے تھے سارے منظر
رات سے رنگِ دیدۂ حیراں برہم تھا

جس عالم کو ہُو کا عالم کہتے ہیں
وہ عالم تھا، اور وہ عالم پیہم تھا

خار خمیدہ سر تھے، بگولے بے آواز
صحرا میں بھی آج کس کا ماتم تھا

روشنیاں اطراف میں زہرآ روشن تھیں
آئینے میں عکس ہی تیرا مدھم تھا

کہاں گئے مرے دلدار و غمگسار سے لوگ
وہ دلبرانِ زمیں، وہ فلک شعار سے لوگ

وہ موسموں کی صفت سب کو باعثِ تسکیں
وہ مہر و مہ کی طرح سب پہ آشکار سے لوگ

ہر آفتاب سے کرنیں سمیٹ لیتے ہیں
ہمارے شہر پہ چھائے ہوئے غبار سے لوگ

ہم ایسے سادہ دلوں کی کہیں پہ جا ہی نہیں
چہار سمت سے اُمنڈے ہیں ہوشیار سے لوگ

لہو لہو ہوں جب آنکھیں، تو کیسا وعدۂ دید
چلے گئے ہیں، سرِ شام کوئے یار سے لوگ

نسیمِ صبح کے جھونکے ہمیں بھی چھو کے گزر
ہمیں بھی یاد ہیں کچھ موسمِ بہار سے لوگ

چیونٹی

ڈال دیتا تھا کوئی دانہ مرے رستے پہ
ان گنت شام و سحر رینگ کے میں جیتی تھی

ناتواں جسم پہ وہ دانے اٹھا لاتی تھی
رینگتے رینگتے پھر بل میں چلی جاتی تھی

ایک دن دھوپ نے احساس دلایا مجھ کو
تو جو ہمت کرے ان پیروں میں دم آ جائے

پھر ہواؤں نے بھی رک رک کر یہ سرگوشی کی
بل کے باہر تو نکل دیکھ ذرا دنیا بھی

میں کھڑے ہونے کی کوشش میں بہت گھبرائی
لڑکھڑا کر میں گری گر کے اٹھی چکرائی

عین اس وقت کوئی آیا سہارے کے لیے
پہلے سینہ مرا مٹی سے لگا رہتا تھا

اب مرا سر کسی شانے سے لگا رہتا ہے۔

لندن میں شہرزاد

شہرِ بغداد کی شہرزاد
مجھ کو لندن کے ایک چائے خانے کے اندر ملی
اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا
میں نے مذہب کی یکسانیت کا سہارا لیا
روایت کو تھاما
محبت سے پوچھا
''تمہیں اپنا فن یاد ہے؟
داستانیں سنانے کا فن

وہ فن جس سے مُردہ دلوں کی کلی کھل گئی تھی
وہ فن جس سے ہر شب کسی ایک کو نئی زندگی مل گئی تھی"

ذرا دیر کو چپ ہوئی شہرزاد
پھر یوں گویا ہوئی
"پوری دنیا کے مانند تم کو خبر ہی نہیں
شہرِ بغداد میں اب سماعت معطل ہوئی
لوگ کیا لفظ بھی مر گئے
اور مرا فن
سماعت کا، لفظوں کا محتاج ہے
میں نے اجداد کی پیروی کی
راہِ ہجرت پہ چلتی ہوئی میں یہاں آ گئی
شہرِ لندن بڑا مہربان شہر ہے
یہاں روز و شب تازہ وارد خلیفہ
موسموں کے تغیر کے ہم راہ
پرندوں کے مانند آتے ہیں
مجھ کو بلاتے ہیں
میرے ہر موئے تن سے نئی داستانوں کو سنتے ہیں
اور لوٹ جاتے ہیں۔"

STOP

ٹھہرو کہہ کر جیسے کسی نے وقت کا دریا روک دیا ہے
ایک طلسمی حرف کہ جس کی طاقت کا اب علم ہوا ہے
اپنی اپنی سمت میں بہتا ہر ہر لمحہ ٹھہر گیا ہے
سارے دوست اور سارے دشمن پتھر بن کر دیکھ رہے ہیں
کیسی انہونی لگتی ہے؟
حالانکہ یہ شہر خرابی جس دن سے تعمیر ہوا تھا
اُس دن سے اس بات کا ڈر تھا۔

حوّا کی کہانی

تمہیں سیب کھانے کی ترغیب میں نے نہیں دی
وہ گیہوں کا دانہ مری دسترس میں نہیں تھا
مری سانپ سے دوستی بھی نہیں تھی

اگر دوستی تھی کسی سے، وہ تم تھے
اگر کوئی اچھا لگا تھا، وہ تم تھے

☆

ہوا نے باندھ دیا رات سلسلہ ایسے
بلا رہا ہے کوئی دور سے لگا ایسے

جہاں بھی دیکھو وہاں پھول کھلنے لگتے ہیں
زمیں پہ چھوڑ گیا کوئی نقشِ پا ایسے

ہمیں لگا کہ کوئی شعر کہہ لیا ہم نے
ذرا سی دیر کہیں کوئی مل گیا ایسے

سکوت ایسا کہ اب خاک تک نہیں اُڑتی
ہوائیں بھول بھی سکتی ہیں، راستہ ایسے

نہ دھوپ میں وہ تڑپ ہے نہ سائے میں وہ کشش
کسی فقیر نے کیا دی ہے بددعا ایسے

آگے بڑھوں تو کوئی مرا منتظر نہیں
پیچھے مڑوں تو کوئی شناسا نہیں مرا

☆

ایک کے گھر کی خدمت کی، اور ایک کے دل سے محبت کی
دونوں فرض نبھا کر اس نے ساری عمر عبادت کی

دستِ طلب کچھ اور بڑھاتے، ہفت اقلیم بھی مل جاتے
ہم نے تو کچھ ٹوٹے پھوٹے جملوں ہی پہ قناعت کی

شہرت کے گہرے دریا میں ڈوبے تو پھر اُبھرے نہیں
جن لوگوں کو اپنا سمجھا جن لوگوں سے محبت کی

ایک دوراہا ایسا آیا دونوں ٹوٹ کے گر جاتے
بچوں کے ہاتھوں نے سنبھالا بوڑھوں ہی نے حفاظت کی

جامۂ الفت بُنتے آئے رشتوں کے دھاگوں سے ہم
عمر کی قینچی کاٹ گئی سب کاہے کو اتنی محنت کی

عمر گزری ہے اسیری میں مگر یہ دیکھو
ایسا لگتا ہے کہ کل قید ہوئے تھے ہم لوگ

☆

عطائے مہر ہیں، نامہربانیوں کے نہیں
جو زخم ہم کو ملے ہیں، وہ دشمنوں کے نہیں

محبتیں تو کجا، یہ مروتوں کے نہیں
یہ کیسے لوگ ہیں، اپنی سہولتوں کے نہیں

ستم تو یہ ہے کہ ہر سیل بے لحاظ کے بعد
کوئی گہر بھی نصیبوں میں ساحلوں کے نہیں

شکستہ پر سے پرندے ہیں، برسرِ دیوار
کہ اب درخت بھی قسمت میں جنگلوں کے نہیں

عجیب رختِ سفر ہے کہ دسترس سے ہے دور
عجیب قافلے والے کہ راستوں کے نہیں

☆

کیوں ایک سا وقت کٹ رہا ہے
کیا دورِ فراق جا چکا ہے

کیوں ساری حقیقتوں کا چہرہ
اک چادرِ وہم سے ڈھکا ہے

کیوں نیند میں لوگ چل رہے ہیں
یہ کیسا ہجوم بے صدا ہے

کیوں ایسے ہوائیں چل رہی ہیں
جیسے کوئی دور رو رہا ہے

یاد آ گیا آج اس کا جانا
مدت میں یہ سانحہ ہوا ہے

جب لوٹ چکے رہ طلب سے
ہر راستہ ہم پہ کھل رہا ہے

وہ نقش قدم کو کیسے ڈھونڈیں
وہ جن کا ہوا سے رابطہ ہے

خوابیدہ پڑے ہیں قفل سارے
قیدی بھی مزے میں سو رہا ہے

کیوں حیرتی ہیں یہ چاند تارے
کیا بام فلک بھی ٹوٹتا ہے

وہ پاس نہیں کہ جس سے کہتے
تم سے مرا دل بہت خفا ہے

آسانی سے کہہ دیا بہت کچھ
یہ صرف غزل کا معجزہ ہے

یہاں دلدار بیگم دفن ہے

ایک انجانا سا ڈر
جب وہ پیدا ہوئی تھی
اُس کے اندر جذب تھا

ایک اندھیری کوٹھری کا خوف
رگ رگ میں بسا تھا
ایک اونچائی سے گر جانے کی دہشت
پیچھے پیچھے چل رہی تھی

ایک دروازے کے پیچھے جا کے چھپ جانے کا شوق
زندگی کی سب سے پہلی آرزو تھی
کھڑکیوں کی اوٹ سے گلیوں کا منظر دیکھنا
زندگی کی سب سے پہلی جستجو تھی

جب ذرا سا وقت گزرا
عقل کے تاروں کی جنبش سے بدن جاگا
حفاظت کا تصور اس قدر وحشت زدہ تھا
کہ اپنے جسم سے شرمندگی ہوتی رہی

پھر خریداروں کی دُنیا میں ذرا سُن گُن ہوئی
دل دھڑکنے کی صدا معدوم ہو کر رہ گئی
خوف کے گہنے سجا کر
اور جھجک کے بے تحاشا پھول پہنا کر
خریداروں نے اس کو پھر سے اندھی کوٹھری میں قید کر ڈالا
وہ جس کا خوف وہ بچپن سے سہتی آ رہی تھی

پھر ذرا سا ہوش آیا
دور تو مری گیا تو آنکھ سے پردہ ہٹا
منظر نظر آنے لگے
پاؤں چوکھٹ کی طرف بڑھنے لگے
اک قدم رکھا ہی تھا کہ ننھے ننھے ہاتھ اک زنجیر بن کر آ گئے

اب وہ اس رستے میں ہے سب جس کو راہِ مرگ کہتے ہیں
منجمد آنکھوں میں اب منظر ٹھہرتے ہی نہیں
اب کسی چوکھٹ کی جانب پاؤں بڑھتے ہی نہیں
ننھے ننھے ہاتھ کچھ اس طرح اونچے ہو گئے
اب دسترس سے دور ہیں
اپنی زنجیروں میں خود محصور ہیں

اس کی اندھی کوٹھری پر ایک کتبہ نصب ہے

"اس جگہ دلدار بیگم دفن ہے
وہ عفیفہ، پارسا، صابر و شاکر سو رہی ہے
یہاں سے غیر مردوں کا گزرنا منع ہے
برائے فاتحہ جو آنا چاہے آئے
لیکن دور سے پڑھ لے۔"

ہزاروں ابوجہل

ہزاروں ابوجہل
راہِ فراست پہ
دانش کے صندوق
سر پہ اٹھائے
چلے آ رہے ہیں
رہگذاروں میں سہمے ہوئے لوگ
ان کے فتووں پہ ایمان لاتے ہوئے
ان کے قدموں میں بچھتے چلے جا رہے ہیں۔

ہر ابوجہل کے ہاتھ میں

آتشیں وہ عصا ہے

جس کی آواز وحشت ہے

کرب و بلا ہے

میرے معبود تیرا یہ ارشاد ہے

اب پیمبر نہیں آئیں گے

پھر بتا

ان کو روکے گا کون؟

آتشیں ان کے ہتھیار اب ان سے چھینے گا کون؟

ڈرو اس وقت سے

ہر طرف دور فراموشی ہے
ذہن سہما ہوا بیٹھا ہے کہیں
اپنے اطراف حفاظت کی طنابیں گاڑے
جب کوئی بات نہیں یاد اس کو
پھر یہ دہشت کا سبب کیا معنی؟
اور حفاظت کا جنوں کیسا ہے؟

ڈرو اس وقت سے جب ایسا خوف
جس کے اسباب نہیں ملتے ہیں

زندگانی میں چلا آتا ہے

روح وجدان بھٹک جاتی ہے
طرز افکار بدل جاتی ہے
صحرا آ جاتے ہیں دیواروں میں
آسمانوں کے ورق کھلتے ہیں
جوق در جوق پرے روح کے
چلتے پھرتے نظر آ جاتے ہیں
اور زمین کانچ کے ٹکڑوں کی طرح ٹوٹتی ہے

وہم تصویر میں ڈھل جاتا ہے
کم نگاہی کا تسلط چپ چاپ
دور اندیشی کو کھا جاتا ہے
ڈرو اس وقت سے جب ایسا خوف
زندگانی میں چلا آتا ہے
جس کے اسباب نہیں ملتے ہیں۔

شام کا پہلا تارا (۲)

میری اس شام کے تارے سے ملاقات بہت گہری تھی
وہ مرا ہمدمِ دیرینہ تھا
میں بہت چھوٹی تھی جب ماں نے بتایا تھا مجھے
"دیکھو دیکھو وہ ادھر، وہ مری انگلی کے قریب
ایک تارا ابھی تمہیں دیکھتا ہے۔"

ان دنوں جب میں ہواؤں کی طرح اڑتی تھی
اور ڈالی کی طرح جھوم کر لہراتی تھی
رات اور دن کے لپٹنے کی گھڑی آتے ہی

صرف اس تارے کی خاطر میں ٹھہر جاتی تھی
وہ مجھے دیکھتا تھا
میں بھی اسے دیکھتی تھی
وہ مجھے ڈھونڈتا تھا
میں بھی اسے ڈھونڈتی تھی
اور اس عید ملاقات کے بعد
روز ہم دونوں بچھڑ جاتے تھے

اپنی منزل کی طرف وہ بھی چلا جاتا تھا
اپنے رستوں کی طرف میں بھی پلٹ آتی تھی

میری اس شام کے تارے سے ملاقات بہت گہری تھی
میں نے تارے کی رفاقت میں شگن کتنے لیے
آج دیکھا نہیں تارا میں نے
آج کی شام جو روز آتا ہے شاید نہیں آئے
راستہ بھول نہ جائے
آج تو جلد نکل آیا ہے تارا میرا
آج کی رات ملاقات ملے گی مجھ کو
ان کے لفظوں کی سوغات ملے گی مجھ کو
میں نے تارے کی رفاقت میں شگن کتنے لیے

اب میں تنہا ہوں
برس بیت گئے ہیں کتنے
کوئی تارا نہیں دیکھا میں نے
دور کی چیز ذرا دھندلی نظر آتی ہے
میری خوابیدہ سماعت کو جگانے کے لیے
صرف آواز اذاں آتی ہے
اب شگن کا ہے سے لوں
کس کے آنے کی امیدیں باندھوں
کس کے جانے سے پریشان رہوں

کل مگر فون کی گھنٹی نے مجھے
اپنے ماحول سے بیدار کیا
زندگی سے مجھے دوچار کیا
ایک امرت بھرا لہجہ مرے کانوں میں گھلا
''اماں کل شام دکھایا ہم نے
اپنے بچوں کو چمکتا تارا......''

''کون سا تارا دکھایا تم نے؟''
''آپ کا شام کا پہلا تارا''

فون جب ختم ہوا

وقت دونوں ہی گلے ملتے تھے

میں نے کھڑکی سے ہٹایا پردہ

آسمان حد نظر تک ورق سادہ تھا

نہ شفق تھی، نہ افق پر ہی کوئی تارا تھا......

یک بیک ایک کرن چہرے پر لہرانے لگی

دور کی چیز ذرا دھندلی نظر آتی ہے

میرا تارا میری پلکوں پر اتر آیا تھا

میں نے انگلی کے سہارے سے اسے تھام لیا

اپنے آنچل میں اسے باندھ لیا

بھلا اس عمر میں یہ ساتھ کسے ملتا ہے

میری اس شام کے تارے سے ملاقات بہت گہری تھی

......مراسم دم دیرینہ تھا۔

ایک پھول سا بچہ

ایک دن تھکا ماندہ
ایک شام بے معنی
ایک رات حیراں سی
میرے ساتھ یہ تینوں
میرے گھر میں رہتے ہیں
ایک دوسرے سے گم
اپنے آپ سے ہم لوگ
بات کرتے رہتے ہیں
اُلجھے سُلجھے لمحوں کی
وقت چادریں بُن کر

ہم کو ڈھانپ دیتا ہے
دیکھتا نہیں مُڑ کر
جلد جلد کٹتا ہے
ہم جو دیکھنا چاہیں
وہ نظر چُراتا ہے
ایک پھول سا بچہ
بے خبر، نڈر، بچا
میرے گھر کے کمروں میں
آ کے غل مچاتا ہے
منجمد خموشی کو
توڑتی ہنسی اُس کی
اس طرح بکھرتی ہے
جیسے ٹھہرے پانی میں
کوئی کنکری پھینکے
عکس جھوم جھوم اٹھے
موج موج لہرائے
ایک دن تھکا ماندہ
جاگ جاگ جاتا ہے
ایک شام بے معنی
حرف حرف بجتی ہے
ایک رات حیراں سی
آنکھ موند لیتی ہے

دل سا آئینہ اب اپنے عکس سے ہے منحرف
اپنے ہی ہاتھوں کو اپنے عہد سے اجتناب

رات بھر ہم جوڑتے رہتے ہیں ٹکڑے خواب کے
صبح ہوتے بھول بھی جاتے ہیں اپنے سارے خواب

☆

رستے سے محافظ کا خطرہ جو نکل جاتا
منزل پہ بھی آ جاتے، نقشہ بھی بدل جاتا

اس جھوٹ کی دلدل سے باہر بھی نکل آتے
دنیا میں بھی سر اُٹھتا، اور گھر بھی سنبھل جاتا

ہنستے ہوئے بوڑھوں کو قصے کئی یاد آتے
روتے ہوئے بچوں کا رونا بھی بہل جاتا

کیوں اپنے پہاڑوں کے سینوں کو جلاتے ہم
خطرہ تو محبت کے اک پھول سے مل جاتا

اس شہر کو راس آئی، ہم جیسوں کی گم نامی
ہم نام بتاتے تو، یہ شہر بھی جل جاتا

وہ ساتھ نہ دیتا تو، وہ داد نہ دیتا تو
یہ لکھنے لکھانے کا جو بھی ہے خلل جاتا

☆

اس فکر و انتشار میں شاہ و وزیر ہیں
یہ خانماں خراب، کہاں کے سفیر ہیں

دست طلب بڑھائیں، نہ ہمت نہ تربیت
کہنے کو ہم بھی اس کی گلی کے فقیر ہیں

یہ دام تار تار سہی کیسے چھوڑ دیں
جب سے کھلی ہے آنکھ اسی کے اسیر ہیں

یہ اور بات، آنکھوں کو عادت نہیں رہی
دنیا کے رنگ اب بھی بہت دلپذیر ہیں

ہم میرزا اسدؔ کے مریدان خوش خیال
یہ مانتے ہیں قبلۂ اشعار میرؔ ہیں

☆

ہر راستہ، راستہ تھا میرا
کس شانے پہ سر رکھا تھا میرا

گل گشت میں گل بہت تھے لیکن
دامن جو بھرا ہوا تھا میرا

کیا عرصۂ صاف تھا محبت
دل آئینہ ہو گیا تھا میرا

میں ایسے سبک ہوئی سفر میں
اسباب تو جاچکا تھا میرا

آئینہ مثال جس کو دیکھا
چہرہ وہی لے گیا تھا میرا

اب مانتے ہو کہ بات سچ تھی
کہنا تو برا لگا تھا میرا

☆

تمہیں یہ وہم کہ تم نے کبھی سنا ہی نہیں
مجھے یقین کہ میں نے کبھی کہا ہی نہیں

ذرا سی دیر کھلا رہ گیا تھا درِ قفس
اندھیرا ایسا در آیا کہ کچھ رہا ہی نہیں

نظر میں ٹھہرا ہوا ماتم نظارہ ہے
مری نگاہ میں اب منظروں کی جا ہی نہیں

جو بس میں ہوتا تو آگے پہنچ کے دکھلاتے
گزرنے والوں نے رستہ ہمیں دیا ہی نہیں

قریب تر تھی محبت میں راہِ ترکِ سوال
ہمیشہ ایسے لگا جیسے فاصلہ ہی نہیں

اب اپنے زخم ہیں اور اپنے اپنے ناخن ہیں
ہزار شکر مسیحا سے واسطہ ہی نہیں

نظم

(اور پھر زندہ گاڑی جانے والیاں لڑکیاں تم سے اپنا حساب مانگیں گی، کہ آخران کا قصور کیا تھا)(قرآن)

''دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ہو''

بیٹی

ماے نی......

مرنے سے پہلے مجھ کو ایک جواب چاہیے
میرے پاس سے تھوڑا ہے، پھر بھی مجھے حساب چاہیے

بابا نے جب تار کا پھندہ دیا گلے میں ڈال
میں نے اپنے ہاتھوں سے خود توڑنا چاہا جال

تو کیوں ڈھونڈ کے رسّی لائی، کیوں باندھے میرے ہاتھ
بابا کو تو یہ کرنا تھا، تو تو عورت ذات......

مائے نی مرنے سے پہلے مجھ کو ایک جواب چاہیے
میرے پاس سے تھوڑا ہے، پھر بھی مجھے حساب چاہیے

ماں

دھیے نی......

سننا چاہے تو سن لے میرا جواب
لینا چاہے تو لے لے میرا حساب

دھیے نی......

جو میں تیرے پھندے، تیرے ہاتھوں بیچ نہ آتی
پھر تو تجھ کو مرتے مرتے، بڑی دیر لگ جاتی

سسک سسک کر مرنے سے جلدی مرجانا اچھا
ایسے ہی جانا ٹھہرے تو جلدی جانا اچھا

ہاتھ کی رتی کنگن تیرے، گلے کا پھندہ ہار
بابل تیرا دل دریاؤ، بڑا ہی عزت دار

تیرے پاس سے تھوڑا ہے، ڈولی لائے کہار
آ میں بند کروں تری آنکھیں، ساجن کھڑے دوار

ایک منتشر سی نظم

بہت دن سے طبیعت منتشر سی ہے، مگر کیوں ہے
اگر یہ علم ہو جاتا تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔۔
میں اپنے آپ سے اُکتا گئی ہوں
ٹھیک ہے
ایسا بھی ہوتا ہے
میں اپنے کام سے بھی تھک گئی ہوں
یہی لکھنا لکھانا اور کیا؟
اب دل نہیں لگتا۔۔

مرے ہاتھوں میں آ کر سب کتابیں روٹھ جاتی ہیں
مضامیں منھ چھپاتے ہیں
قلم، کاغذ، سیاہی، سب مجھے آنکھیں دکھاتے ہیں
چلو کوشش کروں اک آخری کوشش۔۔

گذشتہ رات اک خواب پریشاں میں نے دیکھا تھا
اُسے منظوم کر ڈالوں
کہاں سے ابتدا ہو؟ کہیں سے بھی، بھلا خواب پریشاں کی کوئی تمہید ہوتی ہے
بہت سی نظمیں بے آغاز بھی تو لکھی جاتی ہیں
مگر میں دور کیوں جاؤں؟
میں اپنے شہر ہی سے نظم کا آغاز کرتی ہوں
جہاں رہتی ہوں میں یہ شہر میرا شہرِ غربت ہے
دکھائی گو نہیں دیتا
ایک عرصے سے کئی حاکم حکومت کرنے آتے ہیں
بہت دولت کماتے ہیں
بہت بے آبرو ہوتے ہیں
واپس لوٹ جاتے ہیں
امیروں کے قبیلوں میں حقیقت اور بڑھتی ہے
غریبوں کے ہجوم بے نوا کو خواب ملتے ہیں

مگر یہ بات جو میں لکھ رہی ہوں

ایسے پہلے بھی لکھتی آئی ہوں شاید
اسے میرے کئی ہم عصر شاعر لکھتے رہتے ہیں
کہی باتوں کو پھر دہراؤں یہ اچھا نہیں لگتا ہے
سنا ہے عمر بڑھ جائے تو باتوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے
جو قصہ کہنے بیٹھیں، اس کے دامن سے
نئے قصے الجھتے ہیں
سنانا چاہتے ہیں جو، اسی کو بھول جاتے ہیں
یہی دیکھو!
میں اپنے خواب کو منظوم کرنے جا رہی تھی
گزشتہ شب یہ دیکھا تھا
ہمارے شہر میں اک شور برپا ہے
نئے ناموں کی تختی لگ رہی ہے
چوک میں
اور شاہراہوں پر۔۔
ہمارے لوگ محوِ رقص ہیں زعمِ حفاظت میں
وہ سارے مست ہیں اک شہرِ وحشت میں
مٹھائی بٹ رہی ہے۔۔
جو کہ ہر موقع پہ بٹتی ہے
کوئی پھانسی پہ چڑھ جائے
تو لڈو بانٹتے ہیں ہم
کوئی بے آبرو ہو کر چلا جائے

تو بھنگڑا ناچتے ہیں ہم
وہی پھر واپس آ جائے
تو لڈی ڈالتے ہیں ہم
کوئی پیچھے سے آ کر تخت کا حقدار ہو جائے
''دل ماشاڈ'' کہہ کر اس کا کہنا مانتے ہیں ہم
بھلا اس خواب کا اِن حرکتوں سے کیا تعلق ہے؟
یہ کہنا چاہتی تھی میں

ہجوم فتح مندی میں مجھے بچے نظر آئے
وہ بچے جن کے لب پر، دودھ کی افشاں چمکتی ہے
وہی بچے جو بستے تھام کر اسکول جاتے ہیں
وہ جن کے پھول جیسے پاؤں ہریالی کے بوسوں میں الجھ کر رقص کرتے ہیں

وہ جھولا جھولنے والے
پتنگیں اوڑنے والے۔۔
مجھے بچے نظر آئے
میں پھر بھٹکی۔۔
فضا فکر ایسا تو نہ تھا مجھ میں۔۔
میں لکھنے میں تختی پکڑ ہوں۔۔
نجانے سوچتی کیا ہوں۔۔
مجھے بچے نظر آئے

تو حیرت کیا
اچنبھا کیوں
جہاں پر مرد و زن ہوں گے
وہاں بچے بھی ہوتے ہیں
یکا یک دل کی دھڑکن رک گئی
جب میں نے یہ دیکھا۔۔
ہجوم رقص وحشت منجمد تھا
رہے بچے تو وہ بچے پگھلتے تھے
وہ قطرہ قطرہ مثلِ موم گرتے تھے
جہاں وہ گر رہے تھے
اس جگہ ایک دیو بیٹھا تھا

اور اس عفریت کے سر پر
سفید اور نرم پروں والی کوئی چڑیا بھی بیٹھی تھی
اور اس کی چونچ میں
زیتون کی ڈالی چمکتی تھی

کہاں اک شہر غربت
اور کہاں بے آبرو حاکم
کہاں جشن مسرت
اور نئے ناموں کی تختی

پگھلتے موم سے بچے

پھر اک عفریت

اس کے سر پہ بیٹھی فاختہ

زیتون کی ڈالی

یہ آئیں بائیں شائیں نظم

کیسی لکھ رہی ہوں میں

دماغ و دل معطل ہو تو فکرِ شاعری کیسی؟

یہی دیکھو

میں اپنے خواب کو منظوم کرنے جا رہی تھی

سنا ہے۔۔

عمر بڑھ جائے تو باتوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔۔۔۔

پرانا شجر

رات طوفان میں اک شجر گر پڑا
وہ پرانا شجر ایک مدت سے پتوں سے محروم تھا
اس کی بے روح شاخوں سے تنگ آ کے
سارے پرندے ہوا ہو چکے تھے
اس کے بے رنگ چہرے سے اُکتا کے
سارے ہی موسم صدا ہو چکے تھے
پھر بھی کل رات جب وہ گرا
شاخساروں پر بیٹھے ہوئے
آشیانوں میں سوئے ہوئے
اور ہواؤں میں اُڑتے ہوئے

اس کے سارے پرندوں کے دل تھم گئے
رنگ فق ہو گئے
سینے شق ہو گئے
ان پرندوں کی حیران آنکھوں نے دیکھا
اس پرانے شجر کی تو ساری جڑیں ان کے سینوں سے نکلی ہوئی ہیں۔

کل رات ڈھلے

کل رات ڈھلے یہ سوچا میں نے
میں اپنے خزانے صاف کرلوں
کس کس کا ہے قرض مجھ پہ واجب
اس کا بھی ذرا حساب کرلوں

الماری کی چابی کھو گئی تھی
وہ زنگ بھری پرانی چابی
میں نے اسے کونے کونے ڈھونڈا
مجھ کو تو نہیں ملی کہیں بھی۔

میں نے جو نظر اٹھا کے دیکھا
الماری تو بند ہی نہیں تھی
مٹی کی تہوں میں لپٹے جالے
اک خاک کا ڈھیر لگ رہے تھے۔

وہ ساری نشانیاں ہماری
وہ ساری کہانیاں ہماری
شعلے کی طرح بھڑکنے والی
دھڑکن کی طرح دھڑکنے والی
آرام کی نیند سو رہی تھیں
ان میں کوئی روشنی نہیں تھی
ان میں کہیں زندگی نہیں تھی۔

اندر بھی نہیں اور کہیں باہر بھی نہیں ہے
لگتا ہے کہ اب اپنا کوئی گھر ہی نہیں ہے

مقابلہ تو حریفوں سے ایسا سخت نہ تھا
جو میرا خود سے تصادم ہے معرکہ وہ ہے

جو تیرے ساتھ ہوا طے خرام ناز ہی تھا
جو تونے جا کے دکھایا ہے راستہ وہ ہے

☆

شائستگیِ غم نے عجب کام دکھایا
اک حرفِ تسلی بھی مرے نام نہ آیا

ہر دورِ بلا خیز میں ہنگامِ تمازت
آنکھوں پہ دعاؤں کا لرزتا رہا سایہ

تعظیم اسی کے لیے مخصوص رکھی تھی
وہ جس کو مرے قد کا نکلنا نہیں بھایا

جتنی کہ گزار آئے ہیں اتنی نہیں باقی
جی بھر کے جئیں اس کا سلیقہ نہیں آیا

بچپن کے کھلونوں کو کوئی توڑ گیا ہے
اور ایسے کہ ٹکڑا کوئی بچنے نہیں پایا

حیران بڑے گھر میں کھڑی سوچ رہی ہوں
اس پار یہ چھوٹا سا مکاں کس نے بنایا

دھوپ کڑی کتنی ہو باہر آئیے رحمت گھر پہ ہے
کس کی دعا کا سایہ ہے جو آج بھی میرے سر پہ ہے

☆

مجھے منزلوں کا یقین تھا مرے راستے بھی صحیح تھے
مگر اک ہجوم برہنہ پا سر رہگذار بھی تھا بہت

کبھی مرحلوں سے ور آئے ہم کئی مشکلوں سے گزر گئے
غم دوستی بھی کثیر تھا غم روزگار بھی تھا بہت

وہی ایک وعدۂ بے یقیں وہی ایک جملۂ دلنشیں
مجھے انتظار بھی تھا بہت مجھے اعتبار بھی تھا بہت

نہ نظر کو خواہش دید تھی نہ سلوک ہی کی امید تھی
کبھی حالتِ دلِ زار پر ہمیں اختیار بھی تھا بہت

کئی شعر میں نے لکھے بھی تھے کئی شعر اس نے پڑھے بھی تھے
نہ سمجھ سکا مری بات کو کہ سخن شعار بھی تھا بہت

وہی شور و غل وہی ہاؤ ہو مجھے یاد آتے ہیں بارہا
کبھی ایک عالمِ بے صدا مجھے سازگار بھی تھا بہت

ورثہ

مُڑ کر پیچھے دیکھ رہی ہوں
کیا کیا کچھ ورثے میں ملا تھا
اور کیا کچھ میں چھوڑ رہی ہوں۔

میرا گھر طوفان زدہ تھا
میرے بزرگوں نے دیکھا تھا —
وہ عفریت وقت کی جس نے
ان سے سب کچھ چھین لیا تھا
پھر بھی کیا کچھ مجھ کو ملا تھا

چہروں پر محنت کی چمک تھی
آنکھوں میں غیرت کی دمک تھی
ہاتھ میں ہاتھ دھرے تھے کیسے
خالی ہاتھ بھرے تھے کیسے
مل جل کر رہنے کی روش تھی
زندہ رہنے کی خواہش تھی

یہ سب کچھ اس گھر سے ملا تھا
وہ گھر جو اک خالی گھر تھا۔

میں نے ایک بھرے کنبے میں
اپنے ہنستے بستے گھر میں
خوف کا ورثہ چھوڑ دیا ہے،
رشتۂ جرأت توڑ دیا ہے
لہجوں میں لفظوں کی بچت ہے
قربت میں کتنی وحشت ہے
اپنی خوشیاں اپنے آنگن
اپنے کھلونے اپنے دامن

مڑ کر پیچھے دیکھ رہی ہوں
کیا کیا کچھ ورثہ میں ملا تھا
اور کیا کچھ میں چھوڑ رہی ہوں...

کئی بُت ٹوٹ جاتے ہیں

کئی بت ٹوٹ جاتے ہیں کئی چہرے بکھرتے ہیں
زمانہ تیشۂ لمحات سے
ایک ایک چہرہ توڑ دیتا ہے

رگِ جاں سے زیادہ قرب والے آشنا چہرے
زمانے کی گھٹن میں سانس لاتے دل کشا چہرے

کسی بوجھل سحر میں
مثالِ شبنمِ گل جھلملاتے دل ربا چہرے

شب تاریک میں
تاروں کی صورت رہ دکھاتے رہنما چہرے

عجب قانونِ قدرت ہے
کہ ان چہروں کو اپنے ٹوٹنے کا دکھ نہیں ہوتا

یہ سب چہرے سمجھتے ہیں
پرانے آئینوں میں منعکس ہونے سے کیا حاصل
درازوں سے بھرے ان راستوں میں رونما ہونے سے کیا ہوگا؟

اذیت صرف وہ آنکھیں اٹھاتی ہیں
کہ جن کی پتلیوں میں سارے چہرے دفن ہوتے ہیں۔

نظم

ہر دور کی تیکھی حدت نے
ان آنکھوں سے سب چھین لیا
اب حسن مروت بھی غائب
اقرار محبت بھی گم ہے۔

ہر روز بدلتے وعدوں نے
ان ہاتھوں سے سب چھین لیا
پیمانِ وفا سے قاصر ہیں
اظہار شجاعت بھی گم ہے

ہر سمت الجھتی راہوں نے
ان پیروں سے سب چھین لیا
احساس شکستہ پائی بھی
آزار مسافت بھی گم ہے

اس زخمی خول کے سینے میں
جہاں سانس کا رکنا مشکل ہے
اک دل ہے کہ دھڑکے جاتا ہے
ہاتھوں سے پتنگ بڑھاتا ہے
اور پیروں کو اکساتا ہے
رک رک کے کہتا جاتا ہے

آنکھیں ویراں مت ہونے دو
دھندلا ہی سہی کوئی خواب تو ہو
یہ ہاتھ نہ شل ہو جائیں کہیں
اور کچھ بھی نہیں تو دعا ہی سہی
کہتا ہے کہ پاؤں جمائے رہو
اس خاک پہ کوئی نشاں تو رہے...

ادھر آؤ، ادھر آؤ

وہ سب چپ تھے

مگر یہ کیا ہوا اور کیوں ہوا تھا

مرا خوابوں میں ہنستا بولتا گھر کس طرح دھندلا گیا تھا

دراڑوں سے بھری کچھ سیڑھیاں مردہ پڑی تھیں

سیاہی پوش دیواریں کہ جن کی گردنوں میں جھاڑیوں کے طوق لپٹے تھے

وہ ٹل کھاتا وہ اتراتا ہوا زینہ

کہیں غش کھا کے ایسے گر پڑا تھا

اٹھ نہ سکتا تھا

وہی کمرے وہی مانوس دروازے سبھی چپ تھے

اب ان آنکھوں پہ جالے تن چکے تھے

وہ سب دیمک کی قسمت بن چکے تھے۔

مڑی تھی میں کہ چوکھٹ نے قدم پکڑے

لرزتی کانپتی آواز میں پوچھا

''کہاں سے آئی ہو، اور کون ہو، کاہے کو روتی ہو؟

کسی کو ڈھونڈتی ہو، کیا کسی کو جانتی ہو تم؟

ہمیں پہچانتی ہو، کس طرح پہچانتی ہو تم؟

کہ اس سے قبل کوئی

ابھی ہم پر نہیں رویا۔''

پرندے اجتماعی خواب کے صحرا میں اڑتے ہیں

پرندے اجتماعی خواب کے صحرا میں اڑتے ہیں
جب آنکھیں بند ہوں تو سمت کیسی، راستے کیسے؟
تھکن سے دونوں بازو شل ہیں۔
اور پر جھڑتے جاتے ہیں
ذرا سی دور جا کر آگ کا دریا ملے گا
گر پڑیں گے، خاک ہوں گے۔
پھر ان کے خواب کا غول بیاباں
خس و خاشاک میں تعبیر اپنی دیکھ لے گا۔

وہ گھر

میں اُس گھر کے مقابل کس طرح تنہا کھڑی تھی
وہ گھر جس گھر کا اک اک کونہ مجھ کو یاد تھا
وہ آنگن جس کا اک اک ذرہ جگنو بن کے خوابوں میں چمکتا تھا
وہاں کے پیڑ، پتھر، کھڑکیاں، زینے، مرے ہمراز تھے اور ساتھ کھیلے تھے
وہی دالان جس میں گھنٹیاں چلتے
ہزاروں میل میں نے طے کیے تھے

وہی کمرے وہی مانوس دروازے
جو مجھ سے ادھ کھلی آنکھوں سے کہتے تھے

بس ایک کرن تلک ہے جینا
یہ جان کے گر رہی ہے شبنم

☆

رہ طلب میں وہی ہم سفر بھٹکتے ہیں
جو صرف حوصلۂ احتیاط رکھتے ہیں

کبھی زبان کو آلودۂ شکایت کر
کبھی تو بول، کہ الفاظ یاد رہتے ہیں

نہ ہر راہ کو مشکل سمجھ کے راہ بدل
کہ پتھروں سے بھی دریا کئی نکلتے ہیں

طلوع صبح بہاراں انہیں بھی ایک کرن
جو لوگ تیرا بہت انتظار کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

شاید اس طرح کسی ملت کی آنکھیں کھل جائیں
اے اسیران تہہ دام تڑپنا سیکھو

خاطر خوئے ستم گار سے باز آجاؤ
ٹھیک سے جی نہیں پاتے ہو تو مرنا سیکھو

ہو چکا پردہ تسلیم و رضا بوسیدہ
سر بازار کرو رقص، بکھرنا سیکھو

پتے پتے پہ کرو نظرِ کرم مثلِ صبا
صورتِ گل کسی دامن سے اُلجھنا سیکھو

سر کو آمادہ کرو جرأتِ رسوائی پہ
پابہ زنجیر ہر اک جا سے گزرنا سیکھو

کیسے کیسے صاحبِ ثروت بکنے کو تیار ہوئے
جتنے کوچے تھے بستی کے سب بازار ہوئے

کیسی دعائیں، کیسی صدائیں، جوگی، چیلے، پیر فقیر
تکیے خالی کر کے بھاگے، شہر کے قصے دار ہوئے

☆

وابستہ ہم بھی اہلِ محبت کے در سے ہیں
جتنے بھی خوش سخن ہیں، انہی کی نظر سے ہیں

دامن بھی چاک چاک نہیں، جیب بھی درست
دیوانے اپنے حال سے کچھ باخبر سے ہیں

سب ناقصانِ شہر ہوئے وارثِ کمال
آہنگ و حرف دور کہیں نوحہ گر سے ہیں

تنہائی کے سفر میں کوئی وقت ہی نہیں
اب صبح و شام دونوں ہی گردِ سفر میں ہیں

تاروں کے ڈوبنے سے نہ گھبرا سفر نصیب!
جو رنگ گُھل رہے ہیں نشانِ سحر سے ہیں

☆

آنکھ خشک تھی لیکن دل بھرا بھرا سا تھا
آج اس کی حالت بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی

جس جگہ سے ویرانی ہم سمیٹ کر لائے
وہ بھی ایک دنیا تھی، وہ بھی ایک بستی تھی

مشورہ ہدایت کا سر پہ رکھ کے آئے تھے
دل زدوں کی دنیا میں ایسے کس کی چلتی تھی

بارشوں سے لپٹی تھیں جنگلوں کی خوشبوئیں
دل کے ایک کونے میں آگ سی دہکتی تھی

حسرتیں ہی لکھی تھیں، ہر ورق کے چہرے پر
دیکھ آئے ہر دکاں، یہ کتاب سستی تھی

رہوار زیست سست ہوا وقت تیز رو
زہرا نگاہ تم بھی چلو شام ہوگئی

کوما*

منظر۔ ۱

مری بچے!
تو مت مچلے
ہماری ماں ہیں لیکن
اب نہیں پہچانتیں ہم کو
معالج، دوست، رشتے دار
ہمت ہار بیٹھے ہیں---
مگر آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟ یہ تو بتلائیں!

---

*Coma

لڑکپن میں پڑوسی رہ چکے ہیں آپ؟
تو پھر آیئے اندر —
اسی دالان کے دائیں طرف
وہ ان کا کمرہ ہے۔
وہاں پر نرس بیٹھی ہے
اسی سے حال سارا پوچھ لیجیے گا۔
معافی چاہتے ہیں ہم۔۔۔
ذرا جلدی میں ہیں۔ ہم کو کسی دعوت میں جانا ہے۔

منظر۔ ۲

سنو سسٹر!
کبھی یہ اپنی آنکھیں کھولتی بھی ہیں
کبھی کچھ بولتی بھی ہیں۔
نہیں صاحب
مکمل طور پر غائب ہیں یہ گیارہ مہینوں سے
یہی اک دھونکنی ہے سانس کی جو چلتی رہتی ہے
یہ تار زندگی اب ٹوٹ ہی جائے تو بہتر ہے
نجانے کس طرح یہ سیدھی مٹھی بند کر لی ہے
بہت کوشش کی سب نے، پر نتیجہ کچھ نہیں نکلا!
مجھے لگتا ہے ان کی جان ہے اس بند مٹھی میں۔

منظر۔ ۳

وا اپنا تھرتھراتا ہاتھ اس مٹھی پہ رکھتا ہے
ور اک نمکین قطرہ، بند مٹھی پر ٹپکتا ہے
واس خمسہ کے ساکت سمندر میں کہیں پہ لہر اٹھتی ہے۔
رزتی انگلیاں اک دوسرے سے بات کرتی ہیں
بھتی سانس کی آواز مدھم ہوتی جاتی ہے
و مٹھی کھلتی جاتی ہے۔

ماضی اور حال

ماضی

دو بچے اپنے کمرے سے
تاروں والے کپڑے پہنے
میرے کمرے میں آتے ہیں
مجھ سے لپٹ کر سو جاتے ہیں
اور میری بے خواب آنکھوں میں
نیند کی ٹھنڈک بھر جاتی ہے۔

حال

گھر کی بیوی
اپنی آپا سے کہتی ہے
رات گئے مرے دونوں بچے
کیوں میرے کمرے میں آتے ہیں؟
مجھ سے لپٹ کر سو جاتے ہیں
تم آخر کا ہے کے لیے ہو؟
میری خواب آلود آنکھوں سے
ساری نیند بکھر جاتی ہے۔

خالی بوتل

اک لڑکی سے میں نے پوچھا
خوشبو کی یہ خالی بوتل
اتنے سنبھال کے
کیوں رکھی ہے
ہنس کے بولی
"زہرا آپا۔۔۔
کچھ دن پہلے
اک بڑا جن
اس بوتل میں قید رہا تھا۔۔۔"

''اب وہ کہاں ہے؟''

''اب وہ محلوں کا قیدی ہے
بے چارے کی قسمت دیکھو
اُس کے محل بھی شیشے کے ہیں۔''

شہر کے ایک کشادہ گھر میں

شہر کے ایک کشادہ گھر میں
اپنے اپنے کام سنبھالے
میں اور ایک مری تنہائی
ہم دونوں مل کر رہتے ہیں
باتیں کرتے، روتے ہنستے
ہر دکھ سکھ سہتے رہتے ہیں

آج کہ جب سورج بھی نہیں تھا
پھولوں کے کھلنے کا یہ موسم بھی نہیں تھا

اور فلک پہ چاند کے چھا جانے کا وقت بیت چکا تھا
دروازے کی گھنٹی نے وہ شور مچایا
جس سے پورا گھر تھرایا

ہم دونوں حیران ہوئے کہ ایسا راہی کون رُکا ہے
جو اس گھر کو اپنا گھر ہی سمجھ رہا ہے
کھڑکی سے باہر جھانکا تو بس اک خواب سا منظر دیکھا
سورج بھی دہلیز پہ تھا
اور چاند کواڑ کی اوٹ سے لپٹا جھانک رہا تھا
پھول کھلے تھے

ہم نے اس مہمان کو سر آنکھوں پہ بٹھایا
دل میں جگہ دی
جو اپنے ہمراہ بھی موسم لے آیا
تھکی ہوئی تنہائی نے مجھ سے
تھوڑی دیر کو مہلت مانگی
میں نے اس کو چھٹی دے دی
ساتھ میں یہ تاکید بھی کر دی
دیکھو کل تم اپنے کام پہ جلدی آنا
بھول نہ جانا۔

یہ راہی جو سارے موسم لے آتے ہیں
ان کے رستے ساری دنیا میں جاتے ہیں
جس آنگن میں چلنا سیکھیں
اس آنگن میں رک نہیں پاتے
رک جائیں تو تھک جاتے ہیں۔

☆

یوں کہنے کو پیرایۂ اظہار بہت ہے
یہ دل دلِ ناداں سہی خوددار بہت ہے

دیوانوں کو اب وسعتِ صحرا نہیں درکار
وحشت کے لیے سایۂ دیوار بہت ہے

بجتا ہے گلی کوچوں میں نقارۂ الزام
ملزم کہ خموشی کا وفادار بہت ہے

جب حسن تکلم پہ کڑا وقت پڑے تو
اور کچھ بھی نہ باقی ہو تو تکرار بہت ہے

خود آئینہ گر آئینہ چھوڑے تو نظر آئے
دیکھا ہوا ہر شعلۂ رخسار بہت ہے

منصف کے لیے اذن سماعت پہ ہیں پہرے
اور عدل کی زنجیر میں جھنکار بہت ہے

☆

سب سے ہم اپنی وفا اس کی جفا کیا کہتے
میرؔ کی طرح کہانی سی بھلا کیا کہتے

ایک بازار وفا تھا سر دربار سجا
ایسے عالم میں ہم آشفتہ سرا کیا کہتے

صاحبو! اور تماشہ کوئی ایجاد کرو
دیکھنے والے بھلا اس کے سوا کیا کہتے

رہگذاروں نے کہا جو بھی کہا جس سے کہا
ورنہ جو بیت گئی آبلہ پا کیا کہتے

وہ جو خود اپنے ہی لفظوں سے وفادار نہ تھا
اس کو ہم یاد دلاتے تو بھلا کیا کہتے

بات اٹھانے کی بھی طاقت نہیں جن لوگوں میں
ان سے ہم طرزِ سخن، حسنِ ادا، کیا کہتے

ہم تو تیار تھے ہر دورِ مسافت کے لیے
کیسے مسدود ہوئی راہِ وفا کیا کہتے

☆

ہزاروں میل پیچھے رہ گیا ہے میرا بچپن
مجھے چہرے نظر آتے ہیں اب بھی بادلوں میں

اکیلے پن سے میری دوستی کچھ بڑھ گئی ہے
بہت خوش ہوں میں اپنی ذات ہی کی محفلوں میں

یہ ہر سو کس کی امیدوں کی بارش ہو رہی ہے
یہ کس کی خواہشیں رقصاں ہوئی ہیں جنگلوں میں

جو چھونا چاہتے ہیں آسماں کو یہ بھی سوچیں
بہت سے تنگ رہتے گھومتے ہیں وسعتوں میں

زر منزل لٹا کر راہِ درویشی ملی تھی
مگر اب نیند آتی جا رہی ہے راستوں میں

☆

ہجر کی ساری سختیاں ، جیسے کہ جنگلوں میں آگ
قرب کی ساری نرمیاں ایک شگوفۂ سحر

یہ کب مرے لفظ بجھ گئے کب مری لے الجھ گئی
اے مرے دردمند دل ، رہنے دے مجھ کو بے خبر

یہ جو زمین دے گئی مجھ کو ندامتوں کے زخم
میرے تھکے ہوئے قدم ، اس نے کیے تھے معتبر

جب سے ہوئے امیر عمر، حافظے ہو گئے غریب
یاد کی ساری لذتیں کیسی ہوئی ہیں در بدر

دل نے کئی کہانیاں کہہ کے ہمیں سُلا دیا
کیسی وہ شام مضطرب، کیسی وہ صبح منتشر

☆

اس راہِ شکستہ پر ایوانِ حکومت کیا؟
ٹکڑوں کی ہے کیا قیمت، ملبے کی ہے وسعت کیا؟

کاسہ لیے بیٹھے ہوں، مانگے پہ گزر ہو تو
یہ نازِ شجاعت کیوں، یہ زعمِ حفاظت کیا؟

حاکم دیے جاتے ہیں، احکام قلاشوں کو
جب لفظ ہوں بے حرمت، آدابِ اطاعت کیا؟

حاصل کے نہیں سودے، بازار میں مندی ہے
چل اے دلِ کم مایہ، پھر تیری بھی قیمت کیا؟

قصہ گل بادشاہ کا

نام میرا ہے گل بادشاہ
عمر میری ہے تیرہ برس
اور کہانی
میری عمر کی طرح سے منتشر منتشر
مختصر مختصر۔

میری بے نام بے چہرہ ماں
بے دوا مر گئی
باپ نے اس کو برقعے میں دفنا دیا

اس کو ڈر تھا کہ منکر نکیر
میری اماں کا چہرہ نہ دیکھیں
ویسے زندہ تھی، جب بھی وہ مدفون تھی۔

باپ کا نام زرتاج گل
عمر بتیس برس
وہ مجاہد شہادت کا طالب راہِ حق کا مسافر ہوا
اور جام شہادت بھی اس نے
اپنے بھائی کے ہاتھوں پیا
جو شمالی مجاہد تھا
اور پنج وقتہ نمازی بھی تھا
مسئلہ اس شہادت کا پیچیدہ ہے
اس کو بہتر یہی ہے ہمیں چھوڑ دیں
اب بہر حال پاپا تو جنت میں ہے
اس کے ہاتھوں میں جامِ طہور
اس کی بانہوں میں حور و قصور
میری تقدیر میں بم دھماکے دھواں
پگھلتی ہوئی یہ زمیں
بکھرتا ہوا آسماں

بعد از مرگ وہ زندہ ہے
زندگی مجھ سے شرمندہ ہے

(۲)

کل سر شام دشمن نے آتے ہوئے
بم کے ہمراہ برسا دیے
مجھ پہ کچھ پیلے تھیلے
جن سے مجھ کو ملے
گول روٹی کے ٹکڑے
ایک مکھن کی ٹکیا
ایک شربت کی بوتل
مرنے کا ڈبا

اس کے بدلے میں وہ لے گئے
میرے بھائی کا دست مشقت
جس میں منت کا ڈورا بندھا تھا
میری چھوٹی بہن کا وہ پاؤں
جس سے رنگ حنا چھوٹا تھا

لوگ کہتے ہیں یہ امن کی جنگ ہے

امن کی جنگ میں حملہ آور
صرف بچوں کو بے دست و پا چھوڑتے ہیں
ان کو بھوکا نہیں چھوڑتے
آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے

میں دہکتے پہاڑوں میں تنہا
اپنے ترکے کی بندوق تھامے کھڑا ہوں
تماشائے اہلِ کرم دیکھتا تھا
تماشائے اہلِ کرم دیکھتا ہوں۔

کہانی گل زمینہ کی

گل زمینہ!

سنو۔

تو وہ خاک پر

اپنی کونپل سی انگلی سے

کیا لکھ رہی ہو؟

گل زمینہ نے شربت بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں

اور کہنے لگی

کچھ ہی دن قبل
یہ تو وہ خاک ہی میرا اسکول تھا
میں نے اللہ کا نام
یا حافظ
اس کی دیوار پر لکھ دیا تھا
میرے کاغذ، قلم، اور کتابیں
میرے کنبے کے ہمراہ سب مٹ چکے ہیں
میں یہاں روز آتی ہوں
اپنی یادوں کے ملبے سے
پچھلے سبق ڈھونڈتی ہوں
صفحۂ خاک پر ان کو لکھتی ہوں
اور لوٹ جاتی ہوں
میری قسمت میں پڑھنا نہیں ہے
نہ ہو!
میرا آموختہ
میرا لکھنا تو جاری رہے۔

بے ادب شرط

o

اک نظر دیکھیے تو عالی جناب
چشم پرنم ہے دیدۂ خوں ناب

اکثر اس ایک قطرۂ خوں میں
تختِ شاہاں بھی ہو گئے غرقاب

دیکھتے دیکھتے ہوئے ہیں دریا خشک
سربراہوں کی نیتیں ہیں خراب

تشنگی حد سے ہوگئی ہے سوا
اور حدِ نظر سراب، سراب

اے مرے شہرِ دلبراں تجھ میں
عشق اور حسن دونوں میں نایاب

ماہ رو منہ چھپائے پھرتے ہیں
عاشقی کے بدل گئے آداب

واعظوں کی بھی فکر ہے محدود
سب سے آگے ہے منفعت کا نصاب

دل سے نزدیک دنیوی آرام
آنکھ سے دور آخرت کا ثواب

ہر مصور کا رنگ ہے بے رنگ
ٹوٹ جاتے ہیں نقش مثلِ حباب

نغمے سے زخمی ہوئے ہیں موسیقار
شور کرتے ہیں صرف چنگ و رباب

شاعری فکر کو ترستی ہے
کذب آمیز ہے ہر ایک خطاب

اپنی قسمت کو روتی رہتی ہے
بھری الماریوں میں خالی کتاب

تھوڑے آٹے میں ہوگیا پورا
ساری تنخواہ کا حساب کتاب

ہانڈیاں دل کی طرح خالی ہیں
روٹیاں ذہن کی طرح نایاب

ہر خریدار کے حواس ہیں گم
اور بقال کا دماغ خراب

جانور منھ اٹھا کے روتے ہیں
آنے والا ہے پھر سے کوئی عذاب

بچے غائب ہیں سمتِ کوہ ندا
ڈھونڈتے ہیں گلی گلی ماں باپ

کونپلیں سر نہیں اٹھا پاتیں
گود مٹی کی ہوگئی بے آب

اب کہاں جائیں ڈوبنے کے لیے
جتنے دریا ملے، سبھی پایاب

وقت کیوں ہم سے سود مانگتا ہے
ہم تو چکا چکے ہیں سارے حساب

○

میرے اطراف اک تماشا ہے
ساری دنیا میں جس کا چرچا ہے

ہر گھڑی اسکرین پر دیکھو
گفتگو کا مہیب ریلا ہے

عالموں کی بھی لگ گئی لائن
علم ٹیلی ویژن پہ بکتا ہے

سب کو ہیں عقل و فکر کے دعوے
کیا سیاست نے قد نکالا ہے

ہر طرف حسنِ جبہ و دستار
زینتِ ریش اس پہ طرفہ ہے

ناپتے ہیں گناہ گار کا قد
ہاتھ میں نوکری کا فیتہ ہے

خواہش تسمہ پائی فکر میں ہے
روح لاغر ہے جسم فربہ ہے

اعتقادات کی رہ خوش رنگ
اس پہ کتنا سیاہی ملبہ ہے

آنکھ میں دھند بھر گئی شہرت
فہم میں موتیا اترتا ہے

ہیں بہ ظاہر نصیحتوں کے امیں
اور پسِ پردہ جانے کیا کیا ہے

کھاتے ہیں ہر گھڑی قلابازی
یہ تماشا نہیں ہے شیوہ ہے

طرزِ گفتار کا مُقلِّل انداز
جنبشِ لب سے کرتا رہتا ہے

ان کو ازبر سبھی کتابِ خدا
ذہن معنی کو موڑ دیتا ہے

ہر مسلماں کو دعوتِ تبلیغ
وہ بھی کافر جو کلمہ پڑھتا ہے

اس ادا سے منایا ماہِ صیام
قوم نے پہلا روزہ رکھا ہے؟

اس طرح سے بیان طریقِ وضو
جیسے پاکی انہیں کا ورثہ ہے

نام لیتے ہیں ایسی ہستی کا
جو سراسر کرم کا دریا ہے

میرے سرکارِ دو جہاں کے بقول
جو گنہ گار ہے وہ میرا ہے

اور اللہ نے انہیں کے طفیل
در توبہ کھلا ہی رکھا ہے

میرا مذہب ہے مذہب آساں
جو ہر اک کی سمجھ میں آتا ہے

فون کی کال کے توسط سے
مشوروں میں نہ ہم کو الجھائیں

فائدہ کمپنی کا ہے بسیار
اور اب فائدہ نہ کروائیں

یافت کی اور کوئی رہ ڈھونڈیں
بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

ایک گڑیا کی داستان

ڈفلی بجانے والا بندر
لڑھک گیا، اور دور گرا
لیکن ڈفلی بجتی رہی۔۔
چھک چھک کرنے والی گاڑی
اُلٹ گئی، پہیے گھومے
پھر بھی گاڑی چلتی رہی
ناچنے والا بھالو

نیچے کود گیا اور ناچا بھی۔۔

اس کی ٹوپی جلتی رنگ بدلتی رہی

جیتی جاگتی بولنے والی گڑیا

ایسی سوئی کہ پھر بولی بھی نہیں

جاگی بھی نہیں

ساری دنیا آنکھیں کھولے تکتی رہی!

اجلاس

ہوی میز
ں کے اردگرد
ماحبان فہم
ر جوڑے ہوئے
مٹے پھولوں کے گلدستے
پہلا صاف پانی بوتلوں میں
بلوریں گلاس
ارلب کی تشنگی

تقریر میں حائل نہ ہو

فیصلہ کرنا ہے ان کو جبر کا اور قدر کا

امن کے پیغامبر

آشتی کے ٹھیکے دار

مالکِ ہوش و حواس

ڈیڑھ گھنٹے تک رہا اجلاس

کیمروں کی روشنی، جلتی رہی بجھتی رہی

اور اخباروں کو سرخی مل گئی

گفتگو چلتی رہی۔

صاحبانِ فہم آخر تھک گئے

عاقلانِ دہر اُٹھے۔۔

اپنے اپنے مشوروں کو ساتھ لے کر

اپنے اپنے ہوٹلوں میں سو گئے

ایک پورا شہر شعلوں میں نہاتا ہی رہا

ایک خلقت آگ میں جلتی رہی۔۔

ایک سپاہی کے نام

(جس کے مقدر میں اپنی سرحدوں پر لڑنا نہیں ہے)

جانے والا اپنی راہ پہ جانے کو تیار کھڑا ہے
ہتھیاروں سے بدن سجا ہے
سر پر لوہے کی ٹوپی ہے
کندھے پر خاکی تھیلا ہے
تھیلا کیا ہے؟
جادو کی زنبیل ہی سمجھو......
جس میں اس کی ساری دنیا دوش بدوش چلی آئی ہے
پچھلے جاڑے بوڑھی ماں نے بُن کر ایک مفلر بھیجا تھا

وہ بھی سمٹ کر اک کونے میں بیٹھ گیا ہے
کافی کے میالے مگ پر بچوں کی تصویر چھپی ہے
وہ بھی اک سلوٹ سے نکل کر جھانک رہی ہے
بیوی کی پلکوں کے ستارے......
تھیلے کی اندھیاری رات میں چمک رہے ہیں
تھوڑی دیر میں شانے کی دیوار گرے گی
ابھی سجائی جادونگری مر جائے گی
اک اک چیز بکھر جائے گی......
پھر اک بدصورت طیارہ
دوش ہوا پر شور مچاتا......
چشم فلک سے آنکھ لڑاتا
آگ نگلتا دھواں اڑاتا
سینۂ ارض کو زخمی کرتا......
آ جائے گا......
اپنی اندھی کوکھ سے اک کالا تابوت جنم دے گا
بیوی کی پلکوں کے ستارے
قومی پرچم پر لہراتے
اس تابوت سے لپٹے ہوں گے
ہم سب سوچتے رہ جائیں گے
گھر کو چھوڑ کر صحرا صحرا کاہے کو حیران ہوا وہ
کس کے لیے قربان ہوا وہ!

خوابِ فردوسِ بریں

یہ خبر آئی کہ اس کا سر ملا
سر کی پیمائش ہوئی
پھر زخم دوزی کی گئی
اور یہ اندازہ ہوا

مرنے والا نوجواں تھا

عمر کیا تھی؟
بس یہی اٹھارہ سال
زندگی کرنے کو کُل اٹھارہ سال؟
پردۂ ٹی وی پہ پھر سر کی نمائش لگ گئی

دیکھنے والوں نے دیکھا

ایک وحشت کا سماں

وحشتوں کی داستاں

اور کھلی اک آنکھ

جس میں خواب تھا اُلجھا ہوا

خون میں لتھڑا ہوا

خواب فردوس بریں

دودھ کی اور شہد کی نہریں رواں

منتظر حوریں، کنواری دل نشیں

خوشہ انگور تھامے

سب کے سب مسند نشیں

سرکی پیشانی کھلی تو پھر نظر آیا ہمیں

سجدہ ریزی کا نشاں

دائیں جانب چلنے والوں کا علم

مدح جن کی صفحۂ قرآن پر تحریر ہے

روزِ محشر روشنی جس کی عیاں

اے خدا، اے قادرِ مطلق خدا

اپنے دیں کی آبرو محفوظ رکھ

کس ادا سے ہو رہی ہے آج تکمیل جہاد

جذبہ شوقِ شہادت کس طرح پامال ہے؟

ایک تصویر

رات گئے تک اک تصویر
بولنے والے صندوقوں کے چہرے پر تھی
صبح سویرے اخباروں کی پیشانی پہ اتر آئی تھی
پھر تو گھر کا کونہ کونہ اس تصویر سے بھرا ہوا تھا
میں نے اس سے نظر بچا کر آسمان کو دیکھنا چاہا
حدِ نظر تک نیلا امبر اس تصویر سے ڈھکا ہوا تھا

اس تصویر میں دو شفاف برہنہ تن تھے

تیشۂ نو عمری سے ترشے
شور مچاتی زندہ سڑک پر
الجھے سلجھے پڑے ہوئے تھے
خود بھی تھوڑے بہت زندہ تھے
ان کے گلوں سے چمڑے کی زنجیر بندھی تھی
سر پر ایک دا اور عورت اس زنجیر کو تھامے ہوئے تھی
مٹی کی تختی سے رگوں کا جال تنا تھا
حد نظر تک نیلا امبر اس تصویر سے ڈھکا ہوا تھا

سوچ رہی ہوں

یہ عورت تو اس تہذیب کی پروردہ ہے
جس میں راہِ محبت کی پہلی منزل ہی یہی بدن ہے
شائد ان پوروں سے اس نے
کسی ردائے بدن کے دھاگے
دھیرے دھیرے سلجھائے ہوں
شائد اس نے ان باہوں کے ہار کسی کو پہنائے ہوں
ان ہاتھوں پر عہد وفا کا
گہرے رنگ کا پھول کھلا ہو۔۔
انھیں رگوں نے کوکھ میں پلنے والے کو سیراب کیا ہو

یہ تکریم جسم سے بے بہرہ عورت کیسی عورت ہے
یہ تو تعظیم بدن سے ناواقف عورت کیسی عورت ہے
احکامات پہ عزت کے سودے تو بہت ہوتے دیکھے ہیں
عورت اپنی فطرت بیچے۔۔

شائد پہلی بار ہوا ہے۔

☆

میری کشادہ دلی پر کرے گا کون اصرار
میں تنگ آؤں تو بانہوں کو کون پھیلائے

میں آج تجھ کو نہیں اپنے آپ کو رو لوں
پھر اس کے بعد خدا جانے یہ گھڑی بھی نہ آئے

لندن کی ایک اداس شام

پھر ایک بار یوں ہوا

پھر ایک بار یوں ہوا
کہ آسمان پھٹ گیا
اور زمین جھلس گئی
پہاڑ ریزہ ریزہ بن کے اڑ گئے
سمندروں میں گر پڑے
سمندروں کی سانس رک گئی
تمام جن و انس
سب چرند
سب پرند—

ایک جمی ہوئی فضا میں قید ہو کے برف ہو گئے
اُسی گھڑی نکل پڑا
پانچ سات جھینگروں کا قافلہ
زمین کی بچی کھچی تہوں کو چاٹتا ہوا
جمی ہوئی فضا کو کاٹتا ہوا—

خاردار بانہیں ان کی جھومتی
لال لال آنکھیں ان کی گھومتی
مونچھیں تان تان کے
اک نرالی شان سے
سیٹیاں بجا بجا کے چیختے
اے سکوتِ وقت ٹوٹ
ہم سے کچھ کلام کر—
اے منارِ فن—
جھک ہمیں سلام کر
ہم ہی یادگار ہیں
نائبِ خدا کے علم و فضل کی
اب ہمارے ہاتھ میں جہاں کا انتظام ہے
بس ہمیں دوام ہے
بس ہمیں دوام ہے...

فیتہ چلتا رہتا ہے

اک بٹن دباتے ہی
رنگ و نور کا سیلاب
آنکھ سے گزرتا ہے
ناچتی ہوئی لڑکی
صرف جوتیاں پہنے
اور گنار کی دھن پر
گھومتے ہوئے لڑکے
ایک جیسی تحریریں
ایک جیسی تمثیلیں

تذکرے عبادت کے
پینترے سیاست کے
عشق کی مناجاتیں
حمد، منقبت، نعتیں
گفتگو کے ہنگامے
رات دن خبرنامے
رنگ صرف پانی کا
لہجہ زندگانی کا
اور پھر کسی تہہ سے اک خبر ابھرتی ہے
نیتہ چلنے لگتا ہے
''سینکڑوں ہزاروں لوگ
جیتے جاگتے انسان
رہ گئے خبر بن کر
سٹ گئے عدد بن کر''
ہم ہنن دباتے ہیں
رنگ و نور کا سیلاب
آنکھ سے گزرتا ہے
نیتہ چلتا رہتا ہے
نیتہ کون پڑھتا ہے۔

☆

بھولی بسری یادوں کو لپٹائے ہوئے ہوں
ٹوٹا جال سمندر پر پھیلائے ہوئے ہوں

وحشت کرنے سے بھی دل بیزار ہوا ہے
دشت و سمندر آنچل میں سمٹائے ہوئے ہوں

وہ خوشبو بن کر آئے تو بے شک آئے
میں بھی دست صبا سے ہاتھ ملائے ہوئے ہوں

ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے کچھ رنگ گھلے تھے
ان کی مہندی آج تلک بھی رچائے ہوئے ہوں

جن باتوں کو سُننا تک بار خاطر تھا
آج اُنہی باتوں سے دل بہلائے ہوئے ہوں

☆

دھوپ میں اک مہرباں سایہ تھا میرے ساتھ ساتھ
شام کو بچھڑا ہے اور لگتا ہے اک مدت ہوئی

☆

دیر تک روشنی رہی کل رات
میں نے اوڑھی تھی چاندنی کل رات

ایک مدت کے بعد دھند چھٹی
دل نے اپنی کہی، سنی، کل رات

انگلیاں آسمان چھوتی تھیں
ہاں میری دسترس میں تھی کل رات

اُٹھتا جاتا تھا، پردۂ نسیاں
ایک ایک بات یاد تھی کل رات

طاق دل پہ تھی، گھنگھروؤں کی صدا
ایک جھنزی سی لگی رہی کل رات

جگنوؤں کے سے لمحے اڑتے تھے
میری مٹھی میں آ گئی، کل رات

جب اس نے دیکھا سُنتے سُنتے لوگ سارے سو گئے
کہانیاں سنانے والا، اپنی سمت ہو لیا

☆

حرف حرف گوندھے تھے ، طرزِ مشک بو کی تھی
تم سے بات کرنے کی کیسی آرزو کی تھی

ساتھ ساتھ چلنے کی کس قدر تمنا تھی
ساتھ ساتھ کھونے کی کیسی جستجو کی تھی

وہ نہ جانے کیا سمجھا ، ذکر موسموں کا تھا
میں نے جانے کیا سوچا ، بات رنگ و بو کی تھی

اس ہجوم میں وہ پل کس طرح سے تنہا ہے
جب خموش تھے ہم تم اور گفتگو کی تھی

نذرِ میر

(طرحی غزل)

"چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے"
ہر گل پر ہے بوند لہو کی، کیسا باد و باراں ہے

ننگی شاخوں پر خاموش ہیں سارے خوش الحان پرند
چاروں کھونٹ ہے وحشت لیکن سست خرام غزالاں ہے

کیسی صبحیں، کیسی شامیں، اور کدھر کی راتیں ہیں
خوش وقتی اب شہر بدر ہے، ہر پل بے سروساماں ہے

پیٹھ لگا کر کب تک روکیں، گھر کی دیواروں کو ہم
اک اک اینٹ گری جاتی ہے کیا طرزِ معماراں ہے

نام و نمود کا جامہ پہنے، سب با عزت بن بیٹھے
ٹکڑے ٹکڑے بکھرا ہے جو دامنِ عزت داراں ہے

بڑا معصوم سا ڈر تھا

بہت چھوٹی تھی میں ــــــ
اور اتنا ڈرتی تھی
کہ مت پوچھو
بڑا معصوم سا ڈر تھا
اندھیرے میں مجھے لگتا تھا
اندر کوئی بیٹھا ہے
اکیلے باغ میں جاؤں
تو کوئی پیچھے چلتا ہے
مجھے دالان کے کونوں سے اکثر خوف آتا تھا

وہ پیپل کا گھنا سایہ مجھے
کیسے ڈراتا تھا
بھرے کنبے میں میرا خوف
میرے ساتھ رہتا تھا

مگر اب انتہا یہ ہے
مجھے ڈر ہی نہیں لگتا

میں تنہا ہوں
مکمل طور پر تنہا ......
وہ تنہائی جو ہر انسان کی تقدیر ہوتی ہے
میں اکثر اپنے بچھڑے خوف کو آواز دیتی ہوں

وہ آئے
اور مجھے جادو کی اس نگری میں لے جائے
جہاں ہر ہر قدم پر وہ مرے ہمراہ رہتا تھا

خط

خط کے آنے کا زمانہ خواب ہے
خط بہارِ زندگی کے پھول تھے
ایسے گل ہائے فراواں
جو کبھی مرجھا نہ پائے
صرف مدھم پڑ گئے

خط کے اندر بند مشترکہ خزانے
دو دلوں کی جائیداد اولیں
صورتِ القاب اک ہلکی لکیر
ان کہے کتنے ہی ناموں کی سفیر
کاغذی اس پیراہن میں وہ مہک

جس سے جسم و جاں معطر
جس میں رنگوں کی دھنک

(۲)

جاتے جاتے اُس کا رُکنا
پچھلے دروازے کے پاس
ہاتھ میں تھامے کتاب
دیکھا تو دیوان غالب
نقش چغتائی ہے یہ
یہ مرقع اب کہیں ملتا نہیں
نایاب ہے......

(۳)

رات میں سب سو چکے تو
نقش چغتائی نے آنکھیں کھول دیں
اس مرقع جلد میں چھوٹا سا اک خط بند تھا
صورت القاب ہلکی سی لکیر
اختتام خط پہ اُبھرا
اک X کا نشان*

(۴)

نقش چغتائی کے سارے رنگ
سب غالب کے شعر دیر تک مدھم رہے
سیدھے سادے لفظ
لو دینے لگے......

رشتے

یہ رشتے

ازل سے ابد تک کے رشتے
خواہشوں کی نمو جن کی بنیاد تھی
جن سے دنیائے دل بارگاہِ نظر کیسی آباد تھی

یہ سانسوں کی طرح
رگِ جاں سے پیوست رشتے
ازل سے ابد تک کے رشتے

جب یہ نوٹے

سمندر بھی ساکت رہا

پہاڑ اپنی وضع پہ قائم رہے

زمینیں بھی سوتی رہیں

کچھ ہوا ہی نہیں

ان کا انجام ایسے ہوا جیسے آغاز تھا ہی نہیں۔

دیکھنے گئے تھے ہم

کسی کے آخری نشاں کو دیکھنے گئے تھے ہم
تھکے ہوئے قدم اٹھا رہے تھے بوجھ جسم کا
وہ میرا بے حساب دل —
سمٹ گیا تھا مٹھیوں کی قید میں
ہزار تار سانس کے
الجھ گئے تھے اس طرح —
کہیں کوئی میرا نہ تھا
بس ایک بندشوں سے بے نیاز یاد ساتھ تھی

کہیں پہ تھا، کسی کا تھا
جو اپنی ذات اپنی گرد و پیش میں گھرا رہا
وہ شخص مطمئن تو تھا

کہاں ملیں گے ایسے خوش نصیب لوگ
جو اپنی وضع سے رہیں
جو اپنی شرط پہ جئیں۔۔۔

ایک طلسمی کھیل

کیسے کیسے نام لکھے تھے
وقت نے ماہ و سال کے رُخ پر
طوفانوں نے پالا مارا
سارے ہوگئے تتر بتر ۔۔۔
صیقل کرکے رکھنا چاہا
ہم نے کچھ ناموں کو بچا کر
عمر کی موجیں بہا کے لے گئیں
سارے لعل اور سارے جواہر
طرزِ خرام کے پھول کھلے تھے
آتی جاتی راہ گزر پہ

آج ہے صرف غبار کا پردہ
کیسی منزل کیسا منظر؟
دھجی دھجی بکھر رہی ہے
تنی ہوئی احساس کی چادر
کچھ حرفوں کی مدھم سی لو
کانپ رہی ہے، لرز لرز کر
خوشبو اپنی کھو بیٹھا ہے
سب شعروں کا مشک اور عنبر
صورت اپنی بدل چکے ہیں
عہد عقیدے، مسجد منبر
کیسے خالی ہاتھ کھڑے ہیں
شاہ وزیر، امیر گداگر
اجڑی خواب و خیال کی دنیا
اپنے گھروں میں سب ہیں بے گھر
کیوں کر جوڑیں اپنے ٹکڑے
ہار گئے ہیں سارے رفوگر
خونی بادل گہرے گہرے
چھٹتے نہیں ہیں، برس برس کر
اور زمینیں آنکھیں موندے
مست ہوئی ہیں لہو پی پی کر
ایک طلسمی کھیل رچا ہے
جانے کون ہے یہ جادوگر؟

ساحلِ سراب پر

میں نخلِ گماں کی شاخ تھامے
اک موجۂ نیم جاں کی صورت
ساحل پہ سراب کے کھڑی ہوں
آنکھوں میں ابھر رہی ہے میرے
اک وہم کی ناؤ ہلکے ہلکے
لہرایا ہے بادباں کا بادل

اک ہاتھ جسے میں جانتی ہوں
پیمان کی روشنی دکھا کر

کشتی پہ مجھے بلا رہا ہے
اے عمرِ رواں کی ریت مجھ کو
اس ہم سفری کی راہ دے دے!

جانے کا تو وقت یہ نہیں تھا

تعظیم کو رات جھک گئی ہے
ماتم میں ہیں سارے چاند تارے
ہر راستہ دم بخود کھڑا ہے
اب سارے سبک خرام حیراں
مے خانہ بدوش، گل بداماں
یہ سوچ رہے ہیں، کیوں گیا وہ
اور ایسی ادا سے کیوں گیا وہ
جانے کا تو وقت یہ نہیں تھا۔

۴ نومبر ۲۰۰۷ء

جانے کے بعد

"تم نہیں ہو نہ سہی
فرق نہیں پڑتا ہے"
زندگی ہے کہ بہر طور گزر جاتی ہے۔
نیند ہر حال میں آ جاتی ہے۔
رونے والے بھی تو تھک جاتے ہیں۔
پھر تسلی سے بہل جاتے ہیں۔
روز کی طرح سے سورج بھی نکل آتا ہے
کھڑکیاں کھلتی ہیں پردے بھی سرک جاتے ہیں۔
پھول گلدانوں میں سجتے ہیں مہک جاتے ہیں۔

لیمپ ہر شام اسی طرح سے جل جاتا ہے۔
وہی کمرہ، وہی تصویر، وہی کرسی، میز
سب کے سب ویسے ہی رکھے ہیں جہاں رکھے تھے۔
کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے
ہاں مگر کمرے کے کونے میں وہ بے جان مشین
جس کے تاروں سے رگِ جاں کے کئی رشتے تھے
گھنٹیاں جس میں صداؤں کی بسی رہتی تھیں
ایسی خاموش، جیسے کہ کبھی تھی ہی نہیں
ہاتھ کے لمس سے لو دیتے وہ سارے نمبر
گرد آلود ہیں، افسردہ ہیں، خوابیدہ ہیں
جب سے نیند آئی ہے تم کو وہ نہیں جاگے ہیں۔

دو شعر

ہم ایک دوپٹے کے گھروندے میں پلے تھے
جب اپنے مکانوں میں رہے، روز نہ مل پائے

یہ سوچ کہ نپٹائے ہیں سب کام بہت جلد
میں جاؤں مرے پاس سے کوئی نہ جائے

جس راہ پر گامزن ہو...

جس راہ پہ گامزن ہو زہرا
سوچو تو سہولتیں بہت ہیں

معیار زمانہ کے مطابق
اطراف میں نعمتیں بہت ہیں

تنہائی سے ایسی کیا شکایت
اب اس کی بھی پڑ چکی ہے عادت

وہ لوگ کہاں جو تم کو ٹوکیں
''دیکھو تو قدم سنبھل کے رکھنا
اس راہ میں مشکلیں بہت ہیں''

سب تم کو دعائیں دینے والے
مٹی کی تہوں میں سو چکے ہیں
اب کوئی نہیں جو یہ بھی پوچھے

''کیوں شعر نہیں کہا ہے کوئی
کچھ شعر پرانے ہی سناؤ
اچھا کوئی گیت ہی گنگناؤ''

''کیا کرتی ہو سارے وقت گھر پر
بے کار یوں ہی ٹہل ٹہل کر

آغاز جنوں ہے خود کلامی
اس کا بھی ذرا دھیان رکھنا''

ملتی ہے مشاعروں کی دعوت
تقریبیں، مباحثے، صدارت
تم کیوں نہیں مانتی ہو ان کو

تبدیل تو ہوگا ایک منظر
کچھ لوگ نئے ملیں گے تم سے
اور اچھی طرح ملیں گے تم سے

بیکار بہانے ڈھونڈتی ہو
ہر وقت ہی جھوٹ بولتی ہو

آنگن میں ذرا ٹہل کے دیکھو
باہر بھی ذرا نکل کے دیکھو

اس گونجتی، جاگتی سڑک پہ
جاؤ تو کہیں پہ موڑ ہوگا

اس موڑ پہ رک کے دیکھ لینا
اک راستہ ناگزیر ہوگا

اوڑھے کوئی سو رہا ہے اس پر
سرسبز ہی مامتا کی چادر
پھر اس کے قریب ہی کہیں پر

مہکی ہے وفائے خواہرانہ
اور اس ذرا سی دور ہٹ کر
سویا ہے کوئی لیے خزانہ

لمحوں کی دمکتی چاندنی بھی
لہجوں کی نکھرتی روشنی بھی

کہنے کو یہ سب کہیں نہیں ہیں
سوچو تو یہ سب یہیں کہیں ہیں

یہ لوگ تو ملتے ہی رہیں گے
یہ زخم جو سانس کے قریں ہیں
یہ زخم تو رستے ہی رہیں گے

تم قید سے ان کی باہر آؤ
جتنی بھی ہے زندگی نبھاؤ

یہ لفظ جو دوست تھے تمہارے
یہ آج بھی تم کو چاہتے ہیں

چلمن سے سفید کاغذوں کی
یہ اب بھی تمہیں پکارتے ہیں

پردہ تو ہٹاؤ سامنے سے
دھندلا سبھی منظروں کا چہرہ

لیکن اس دھند میں سڑک پہ
تارا سا کہیں چمک رہا ہے

اک سانولی، منحنی سی لڑکی
کندھے سے لگائے اپنا بستہ

اسکول کی بس کی منتظر ہے
ماں باپ نے سوچ کر سمجھ کر
نام اس کا بھی زہرا رکھ دیا ہے

خوشبو سے موتیا معطر
چمپا نے بھی سر اٹھا لیا ہے۔

ایجاب و قبول

کچے کاغذ پر مہر لگی
دو چار نے آ کے گواہی دی
کچھ لوگوں نے پھر یہ بھی سنا
ہاں میں نے تم کو قبول کیا
وہ تنہا بیٹھی کمرے میں
یہ سوچ رہی ہے، رہ رہ کر
باتیں تو ان سے کراوں گی
پر ان کو دیکھوں گی کیوں کر

لفظوں میں جھوٹ پنپتا ہے
اور آنکھوں سے یہ ڈرتا ہے
تن من کے جھوٹے دھندوں میں
بس آنکھیں سچی ہوتی ہیں
جو ہرگز جھوٹ نہیں کہتیں
جو ہرگز جھوٹ نہیں سہتیں

ایک سچّی امّاں کی کہانی

مرے بچے یہ کہتے ہیں
''تم آتی ہو تو گھر میں رونقیں، خوشبوئیں آتی ہیں
یہ جنت جو ملی ہے سب انہیں قدموں کی برکت ہے
ہمارے واسطے رکھنا تمہارا اک سعادت ہے......''

بڑی مشکل سے میں دامن چھڑا کر لوٹ آئی ہوں
وہ آنسو اور وہ غمگین چہرے یاد آتے ہیں
ابھی مت جاؤ، رک جاؤ، یہ سب جملے ستاتے ہیں

میں یہ ساری کہانی ہر آنے والے کو سناتی ہوں
مرے لہجے سے وہ اپنا جھوٹ سب پہچان جاتے ہیں
بہت تہذیب والے لوگ ہیں سب مان جاتے ہیں۔

ہاتھ

باندھنی باندھنے والی لڑکی
چنیاں کاڑھنے والی لڑکی
اپنے ہاتھوں کو جب دیکھتی ہے
سوچتی ہے کہ یہ ہاتھ میرے نہیں
میں نے ان سے دھنک کو چھوا
باندھنی میں سمویا
گرہ باندھ کر —
اپنے خوابوں کی رنگت چھپا دی

میں نے توڑا چنبیلی کا پھول
آنچلوں میں پرویا
اور پروتے ہی آنکھوں سے شبنم گرادی
چاند سے میرے ناخن
اُلجھتے ہوئے تاروں سے
ٹوٹتے آتے جاتے رہے ہیں
زخم سوئیوں کے—
پوروں میں مہندی لگاتے رہے ہیں
اس ہتھیلی پہ بکھری لکیریں
مقدر کا وہ جال ہیں—
جن میں اب تک کوئی پھول
اُبھرا نہیں ہے
کوئی رنگ نکھرا نہیں ہے
رنگ رس گھولتے
خوشبوئیں بانٹتے
سب سے بے رنگ
بے رس
مرے ہاتھ ہیں!

کوئی تھی

شعاعوں میں ستارہ دیکھتی تھی
سویرے اُٹھ کے چہرہ دیکھتی تھی
نہیں تھی ماہ رو پر اپنے رُخ پہ
ذہانت کا اجالا دیکھتی تھی
شمار اس کا نہ تھا اہلِ نظر میں
مگر اچھوں سے اچھا دیکھتی تھی
لکیروں میں چھپے تھے چاند سورج
وہ مٹھی کھول کیا کیا دیکھتی تھی

وہ نقشِ پا سے تھوڑی منحرف تھی
بہت ہی صاف رستہ دیکھتی تھی

خیال آتے تھے اس تک گنگناتے
سُروں سے مل کر مکھڑا دیکھتی تھی

کبھی مصرعے سجاتی تھی اٹھا کر
کبھی اشعار زندہ دیکھتی تھی

کھل جاتی تھی کلیوں کے بہانے
ہوا سے اپنا رشتہ دیکھتی تھی

بڑی خوش چشم تھی، گلشن تو گلشن
وہ صحراؤں میں سبزہ دیکھتی تھی

درِ مہر و محبت اس پہ وا تھے
وہیں سے سب علاقہ دیکھتی تھی

بہت دن سے نہیں دیکھا ہے اس کو
وہ جس کو ساری دنیا دیکھتی تھی

☆

ہم لوگ جو خاک چھانتے ہیں
مٹی سے گہر نکالتے ہیں

بے شعلۂ دیں، کہ شمع کفر
پروانے کہاں یہ جانتے ہیں

اس گنبدِ بے صدا میں ہم لوگ
الفاظ کے بت تراشتے ہیں

اے سایۂ ابر اب تو رک جا
اک عمر سے دھوپ کاٹتے ہیں

گھر کو جلاؤ، رت کے دریا کو خوں کرو
اب فصلِ گل گزرنے کو ہے، کچھ جنوں کرو

پتھر بنائے سب کو، کسی سامری کو لاؤ
ان عاقلانِ شہر پہ ایسا فسوں کرو

جس آئینے کو جلا میرے خدوخال نے دی
وہ آئینہ تو مرے عکس ہی سے ٹوٹ گیا

قید میں باخبر رہے ہم لوگ
چشم زنجیر کو کھلا رکھا

☆

سر جھکائے ہوئے اک راہ پہ چلتے رہیے
ایک صدا کان میں آئے گی وہ سنتے رہیے

مڑ کے دیکھیں گے تو پتھر نہیں ہو جائیں گے آپ
مڑ کے دیکھیے، اور آگے بھی چلتے رہیے

ایسے سناٹے میں جب بار ہو آوازِ نفس
صورتِ درد کسی دل میں دھڑکتے رہیے

فراز کے لیے

کہاں وہ شاعرِ رنگیں نوا کہ جس کی غزل
ورق سے اُڑ کے ہمارے دلوں تک آتی تھی

پاکستان کے وکیلوں کے نام

ہم یہ سمجھے تھے قفس میں قید ہو بے بال و پر
تم تو سر ٹکرا کے دیوارِ قفس کو توڑ آئے

وہ کتاب

مری زندگی کی لکھی ہوئی
مرے طاق دل پہ سجی ہوئی
وہ کتاب اب بھی ہے منتظر
جسے میں کبھی نہیں پڑھ سکی

وہ تمام باب سجی ورق
ہیں ابھی تلک بھی جڑے ہوئے
مرا عہد دید بھی آج تک
انہیں وہ جدائی نہ دے سکا

جو ہر اک کتاب کی روح ہے

مجھے خوف ہے کہ کتاب میں
مرے روز و شب کی اذیتیں
وہ ندامتیں، وہ ملامتیں
کسی حاشیے پہ رقم نہ ہوں
میں فریب خوردۂ برتری
میں اسیرِ حلقۂ بزدلی
وہ کتاب کیسے پڑھوں گی میں؟

Scanned with CamScanner

اغلاط نامہ

صفحہ نمبر	مصرعہ	یوں پڑھیے
۴۱	۲	جوق در جوق پرے روحوں کے
۵۵	۳	ذرا سی دیر کھلا رہ گیا تھا چاکِ قفس
۸۵	۵	نہ سنگِ راہ کو مشکل سمجھ کے راہ بدل
۸۷	آخری	نگیے خالی کر کے بھاگے، شہر کے حصے دار ہوئے
۱۴۰	۱۴	مٹ گئے خبر بن کر"
۱۵۴	۷	کہیں کوئی سرا نہ تھا
۱۵۵	۲	جو اپنی ذات اپنے گرد و پیش میں گھرا رہا
۱۶۴	۸	ایسی خاموش ہے، جیسے کہ کبھی تھی ہی نہیں
۱۶۵	۱۱	بے کار یونہیں ٹہل ٹہل کر
۱۷۴	۱	میں یہ ساری کہانی آنے والوں کو سناتی ہوں
		مرے لہجے سے لپٹا جھوٹ سب پہچان جاتے ہیں
۱۷۶	۷	کھلی جاتی تھی کلیوں کے بہانے
۱۷۷	۳	فارسی کے ایک شعر سے استفادہ
۱۷۸	۱	گھر کو جلاؤ، ریت کے دریا کو خوں کرو

37131 113 613 517
FV Fairview
اردو شاعری کے جدید دور کی ایک قابلِ قدر خصوصیت جو اسے اپنے پیش رو سے جدا کرتی ہے،
ایک بڑی تعداد میں خواتین شعراء کی موجودگی ہے جن میں کئی شاعرات نے اپنے لیے ایک اہم
ادبی جگہ بنائی ہے۔ زہرا کو ان میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا
غزل سے کی اور پھر نظم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ دونوں اصناف میں مضامین کی خصوصیت، ان کی
موسیقی، الفاظ کی بندش قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کی نظموں کا انداز بھی ان کے
ذوقِ غزل ہی سے متاثر ہے۔ مگر نظموں میں حقیقت نگاری کا عنصر حاوی ہے۔ ناانصافیوں اور
رکاوٹوں کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا تیسرا شعری مجموعہ بھی نئی منزلوں کی
جانب نشاندہی کرے گا۔
منیب الرحمن
ISBN: 978-969-568-023-0
9695 680230
k Rs: 220/-
Zahrā Nigāh.
Firāq /